علامہ اقبال کا تصوّرِ وطنیت

وحید قریشی

پاکستانی قومیت کے حوالے سے کئی سوال سامنے آتے ہیں ۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور حصولِ پاکستان کی جد و جہد کا بنیادی محور یہ احساس تھا کہ ایک ایسا خطۂ ارض وجود میں آئے گا جو اسلام کی تجربہ گاہ ہوگا اور اس اعتبار سے جغرافیائی حدود کا مطالبہ اسلامی قدروں کے نفاذ کا مسئلہ قرار پاتا ہے ۔ مغربی تصورِ وطنیت اور اسلام کے تصوّرِ ملت کے درمیان کیا فرق ہے ؟ مغرب میں قومیت کا تصور چند بنیادی امور پر مشتمل ہے ۔ رنگ و نسل ، زبان اور جغرافیہ وہ وحدتیں ہیں جن سے مختلف ملکوں کے باشندے اپنا قومی تشخّص متعین کرتے ہیں ۔ اقبال کے نزدیک مغرب کا تصورِ وطنیت جب ایک نصب العین کی صورت اختیار کرتا ہے تو اسلام کی بنیادی روح سے متصادم ہے کیونکہ اسلام بنی نوع انسان کی وہ وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالا تر ہے ۔ شروع شروع میں علامہ اقبال مغرب کے تصورِ وطنیت کے قائل تھے اور انھوں نے وطن کے تصور کو ''بانگِ درا'' کی بعض نظموں میں ایک روحانی رنگ بھی دیا ، لیکن بہت جلد اس اثر سے نکل آئے اور وطنیت کے مغربی تصور کی کھلم کھلا مخالفت کی ۔ چنانچہ وطن کو جغرافیے کی قیود سے آزاد کرکے ایک فکری ضابطے کے طور پر ترتیب دیا ، ان کی رائے میں :

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا[1]

یہ شعر بظاہر ملک کے جغرافیائی خد و خال کی مخالفت کرتا ہے ۔ جب ہم پاکستان یا پاکستانی قومیت کی بات کرتے ہیں تو اس شعر کے معانی و

۱۔ بانگِ درا ، ص ۲۲۹ ۔

مطالب ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آیا اقبال وطن کی محبت کو تسلیم بھی کرتے ہیں یا نہیں ؟ دوسری طرف خود تصور پاکستان کے داعی کی حیثیت سے علامہ اقبال کی ایک خاص اہمیت ہے اور انھوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں تصور پاکستان کی جھلک ماضی بعید میں ایک امکانی صورت کے طور پر دیکھی تھی ۔ اس کے بعد گول میز کانفرس میں مسلم مندوبین کے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو جو بیان دیا اس کا آخری پیراگراف بڑی اہمیت کا حامل ہے :

"آخر میں میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں ۔ جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو ، جنھیں وہ اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھتی ہے ، نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسی رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے ، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے ؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی ، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیش نظر اس طرح تقسیم کرنا ہوگا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے"[۲] ۔

علامہ اقبال کے ہاں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ سیاسی افکار کے حوالے سے نمودار ہوتا ہے ۔ وہ ۱۹۳۴ء سے لے کر انتقال تک مطالبۂ پاکستان کی تفصیلات کا جائزہ لیتے رہے ۔ پھر "گرد وطن" اور "تصور پاکستان" کی درمیانی کڑیاں کس طرح ملائی جائیں گی ؟ وہ تصور وطنیت جس کا آغاز ان کے ہاں جغرافیائی بنیاد سے ہوا تھا اور جس کی پہلی واضح صورت دھرتی پوجا کے طور پر سامنے آئی تھی اسے بہت جلد ترک کرکے علامہ نے اسلام کے ضابطۂ حیات کے حوالے سے وطن کے تصور پر غور کرنا شروع کیا ۔ اس نئے تناظر میں سب سے پہلے ان کی نظر تہذیبی اساس کی طرف گئی اور یہاں سے رفتہ رفتہ یہ سفر "مجرد تصورات" سے "معاملات" کی طرف چلا گیا

۲۔ حرف اقبال مؤلفہ لطیف احمد شیروانی ، جنوری ۱۹۵۵ء ، صفحات ۲۱۶ ، ۲۱۷ ۔

تا آنکہ اُنھوں نے قائد اعظم کے نام اپنے خطوط میں سیاسی پلیٹ فارم سے پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے کی تجویز پیش فرمائی ۔

اقبال وطن کی محبت کو نفسیاتی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اور اسے اسلام سے متصادم شمار نہیں کرتے لیکن جب مغربی ممالک ایک نصب العین کے طور پر پیش نظر رکھتے ہیں تو اقبال اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ اس سیاق و سباق میں جب ہم پاکستان اور پاکستانی قومیت کے مسئلے سے دو چار ہوتے ہیں تو کئی پیچ در پیچ معاملات ہمارا راستہ کاٹتے نظر آتے ہیں ۔ ان گوناگوں سوالوں میں سب سے اہم سوالات یہ ہیں :

(۱) پاکستان ایک جغرافیائی حقیقت ہے جس میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقلیتیں بھی آباد ہیں ۔ اس حیثیت سے ان اقلیتوں کا یہاں کی سیاسی ، سماجی اور تمدنی زندگی میں کیا کردار ہونا چاہیے ؟ نیز پاکستان کی جغرافیائی وحدت اور دوسرے مسلمان ممالک کے درمیان کیا رشتہ ممکن ہے ؟

(۲) قومی تشخص اور ملی تشخص کیا دو مختلف چیزیں ہیں یا ایک ہی حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں ؟ اس خطۂ پاک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اس اعتبار سے اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے میں انھیں مؤثر عددی اکثریت حاصل ہے لیکن ایک اسلامی ریاست میں اقلیتوں کی قومیت کس حوالے سے متعین ہوگی ؟

(۳) پاکستان وجود میں آیا تو آبادیوں کی تبدیلیاں ہوئیں ، مقامی اور مہاجر کے امتیازات اُبھرے اور تہذیبی سطح پر تغیر و تبدل کے کئی پہلو ظاہر ہوئے ۔ حصول پاکستان سے پہلے یہ علاقہ وسیع تر برصغیر کا سیاسی حصہ تھا اور یہاں کے بسنے والے مسلمان ''ہندی مسلمان'' کہلاتے تھے اب اس برصغیر پر دو ملک ہیں ، بھارت اور پاکستان ۔ دونوں ممالک میں مسلمان موجود ہیں اس لحاظ سے بھارت کے مسلمان پاکستان کے مسلمان الگ الگ ملک کے باشندے ہیں یعنی ہندی مسلمان الگ اور پاکستانی مسلمان الگ ۔ تو ان میں اور پاکستان کے مسلمانوں

میں فکر و نظر کی کون کون سی مشابہتیں اور کون کون سے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ۔ پاکستانی مسلمانوں کا قومی رشتہ بھارت کے مسلمانوں اور دیگر مسلم ممالک کے ساتھ کیا ہے ؟

(۴) پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ اہم ہے کہ آیا مغرب کے وطنی تصور کو قبول کرنا ہوگا یا اسے رد کرکے اپنے تشخص کو ملی عزائم کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے ؟

(۵) پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے ۔ مختلف مسلمان ممالک میں یہ لسانی اختلاف موجود ہے ۔ ایران میں فارسی ، عرب ممالک میں عربی ، پاکستان میں اُردو ، انڈونیشیا میں انڈونیشیائی زبانیں ملکی اور قومی سطح پر چل رہی ہیں ، تو پھر اس بات کی تلاش ضروری ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں زبانوں کی کیا اہمیت رہی ہے اور زبانوں کے بارے تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا ہے ؟

ان سوالوں کے علاوہ بھی بہت سے سوال سامنے آتے ہیں جن کے صحیح حل پر ہماری قومیت کی بنیادیں استوار ہو سکتی ہیں ۔ لیکن اتنے اُلجھے ہوئے سوالات کا کوئی مختصر سا جواب تو ممکن نہیں ؛ ہاں غور و فکر کے لیے بعض راہیں ضرور متعین کی جا سکتی ہیں ۔ اس مقالے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کی تحریروں کے حوالے سے بعض مسائل کے بارے میں گفتگو کی جا سکے ۔

علامہ نے اشعار میں جا بجا وطنیت کے مغربی تصور کی مخالفت کی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی نثری تحریروں میں بھی مسلمان ممالک کی عمرانی تاریخ کی مدد سے مسلمانوں کے تصور وطنیت کے بارے میں بعض بنیادی تصورات ملتے ہیں ۔ اس مرحلے پر جغرافیے اور مجرد تصورات کے درمیان ربط کی تلاش ہمیں پاکستانی قومیت کے اصل بنیاد تک لے جا سکتی ہے ۔ ذیل میں علامہ کی تحریروں سے تین اقتباس پیش کرکے ان کے پس پردہ فکری رشتوں کا سراغ لگانے کی سعی کی گئی ہے تاکہ مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں کسی واضح راستے کا تعین ہو سکے ۔

(۱) علامہ نے The Reconstruction of Religious Thought in Islam p. 159 میں جغرافیائی اور سیاسی حوالے سے

مندرجہ ذیل پیراگراف لکھا ہے :

"For the present every Muslim nation must sink into her own deeper self, *temporarily* focus her vision on herself alone, until all are strong and powerful to form a living family of republics. A true and living unity, according to the nationalist thinkers, is not so easy to be achieved by a merely symbolical overlordship. It is truly manifested in a multiplicity of free independent units where racial rivalries are adjusted and harmonized by the unifying bond of a common spiritual aspiration." 2 b.

(۲) ۱۹۱۲ء میں ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ، کے عنوان سے علامہ اقبال کے انگریزی مقالے کا جو ترجمہ ملتا ہے اس میں مندرجہ ذیل اقتباس قابل غور ہے :

''مسلمانوں اور دلیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے ۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن ، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں ۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارو مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے ۔ اسلام کی کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائلِ مخصوصہ اور شمائلِ مختصہ پر نہیں ہے ۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے ۔''

(۳) روزنامہ ''احسان'' میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو علامہ کا ایک بیان مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں شائع ہوا ، جس میں فرماتے ہیں :

The Reconstruction of Religious Thought in Islam ed. 2. b. 1960. p. 159.

"اگر وطنیت کا جذبہ ایسا اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش ہوئی کیوں ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک عالمگیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو کیوں نہ اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی ۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا ۔ مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دین قیم اور اُمتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان کو چھوڑنا یا ان کو کسی دوسری ہیئت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا ۔ ابوجہل اور ابولہب اُمتِ مسلمہ کو ہی آزادی سے پھلنا پھولنا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ہی ان سے نزع در پیش آئی ۔ محمدؐ (فداہ امی و ابی) کی قوم بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی ، لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بننے لگی تو اب قومی حیثیت ثانوی رہ گئی ۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے ، وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے ، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے ۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا :

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را
نہ دادند نکتۂ دیں اہلِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ
نہ دادے دعوتِ دیں بو لہب را [۳]

حضور رسالت مآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپؐ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں ، مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے ۔ اگر حضور نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس

۳۔ مقالاتِ اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ، ص ۲۲۳ ۔

میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبیٔ آخرالزمان کی راہ نہ ہوتی ۔ نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا ، بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے جو زمان و مکان ، وطن ، قوم ، نسل ، نسب ، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخئیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ''ابدیت'' سے ہمکنار رہتا ہے ۔ یہ ہے مقامِ محمدی ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا ۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے تک معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں ۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی ، قبائلی ، نسلی ، لونی اور لسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں اسلام نے وہ کام تیرہ سو سال میں کیا ہے جو دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہ ہو سکا ۔ یقین جانیئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ ایسے عمل کو حال کی سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے خود بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا''[۴] ۔

اقبال کے یہ تین اقتباسات ان کی زندگی کے تین مختلف ادوار سے لیے گئے ہیں ۔ تینوں کے درمیان ایک فکری ربط موجود ہے ۔ پہلے اقتباس میں علامہ نے جو کچھ کہا ہے اس میں عالمِ اسلام کے حوالہ سے بات کہی گئی ہے ۔ مسلمان ممالک کے درمیان جدا جدا ممالک کے طور پر رہتے ہوئے بھی ایک ہم آہنگی کی تلاش ضروری قرار دی گئی ہے ۔ اس میں Temporarily

---

۴۔ حرف اقبال ، مؤلفہ لطیف احمد شیروانی ، جنوری ۱۹۵۵ ، صفحات ۲۳۶ ، ۲۳۸ ۔

کا لفظ اہم ہے اور Sink Deeper کا مشورہ ایک عارضی اقدام کے طور پر ہی گوارا کیا گیا ہے ۔ اس میں ان مسلمان ممالک کے درمیان فکری رابطے کی جستجو ، جہاں جہاں مسلمان ایک اہم اور موثر عنصر کے طور پر موجود ہیں ، ایک اہم فریضہ بن جاتی ہے ۔ دوسرا اقتباس اشتراکِ زبان ، اشتراکِ وطن اور اشتراکِ اغراضِ اقتصادی کو بنیاد نہیں مانتا ۔ اقبال کے نزدیک جب تک اخلاق اور دینی اقدار کسی نظامِ معاشرت کی بنیاد نہیں بنتیں ، اس وقت تک مادی ذرائع چنگیزیت کا رنگ اختیار کرتے رہتے ہیں اور اگر مادی وسائل ہی کو اصل اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ اسلام سے متصادم ہو جاتے ہیں ، گویا ایک نظریاتی ریاست کے لیے مادی فوائد کو فقط اعلیٰ مقاصد کے حصول ہی کا ذریعہ ہونا چاہیے نہ کہ خود مقصد ۔ بصورت دیگر یہ اقدام ''بت پرستی'' کے ذیل میں آئے گا ۔

تیسرے اقتباس میں یہ بنیادی نکتہ اُٹھایا گیا ہے کہ :

اگر قوم از وطن بودے محمدؐ — نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را[۵]

جس کا بدیہی مطلب یہ ہے کہ اصل اہمیت بنیادی نصب العین اور اقدار کو ہے ، مادی فوائد اور مادی وسائل کو نہیں ۔ ان تینوں اقتباسات کا مرکزی زاویہ یہی ہے کہ دین اور دنیا دونوں اہم ہیں لیکن دنیا کو دین کے تابع رہنا چاہیے ۔

دوسرا اقتباس اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں زمان و مکان کا حوالہ آیا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ زمان و مکان کے تصور کی نوعیت اور اہمیت معلوم کرنے میں صرف کیا اور وہ اسے اسلامی معاشرے کے لیے موت و حیات کا مسئلہ قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے مکان سے زمان کے سفر کو مذکورہ اقتباس میں ایک تنزیہی تصور بھی قرار دیا ہے اس اعتبار سے اگر ہم علامہ کے فکر کے مرکزی نقطے پر بھروسا کریں تو ان کے تصورِ وطنیت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اقبال وطن کی محبت کو نفسیاتی سطح پر ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف نہیں لیکن وہ مادے سے روح ، مکان سے زمان ، اور دنیاوی حقائق سے تجریدی حقائق کی طرف سفر کو لازمی قرار دیتے ہیں ۔ وطن کو نفسیاتی

۵۔ مقالاتِ اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ، ص ۲۳۳ ۔

محبت کی سطح سے عقیدے اور اقدار تک لے جانے کی جد و جہد در حقیقت علامہ کے تصور وطنیت کی بنیاد ہے ۔ مادی اغراض کو روحانی اقدار کے تابع رکھنے کا یہی بنیادی وصف علامہ اقبال کے نزدیک سب سے اہم ہے ۔ وطن کو ٹھوس جغرافیائی حدود سے وسیع تر سطحوں پر لے جانے کا عمل تصور ملت کی اساس ہے ، اگر اس کے پس پشت دنیاوی اغراض کی بجائے دینی اقدار ہوں گی تو یہ سفر ہمیں عالم اسلام کی فکری وحدت کی طرف لے جائے گا اور اُس کی غایت کی طرف بھی جس کے مطابق اسلام کا نظام بنیادی طور پر عالم انسانیت کے لیے ہے ، زمان و مکاں کی قیود سے مبرّا ہے اور اس میں سارے عالم کے لیے فلاح کا پیغام مضمر ہے ۔

اس تنزیہی طریق کار کو علامہ اقبال نے زندگی کے دوسرے دوائر میں بھی اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن وطن کے تصور کے سلسلے میں اس کی اہمیت کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتی ۔ علامہ نے اسے جا بجا مثالیں دے کر واضح کیا ہے اور تاریخ اسلام کے سماجی پہلوؤں سے بھی یہی بات آشکار ہوتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی گئے اسی کو اپنا وطن قرار دیا اور وہاں کی تمدنی زندگی کا حصہ بن کر اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہوئے ۔ رسول پاکؐ کی ہجرت میں بھی علامہ کے نزدیک یہی اشارہ موجود ہے کہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے اپنے علاقے اور شہر کی محبت کو قربان کیا جا سکتا ہے ۔ لم یلد و لم یولد کی وضاحت کرتے ہوئے رموز بے خودی میں فرماتے ہیں :

قوم تو از رنگ و خون بالا تر است
قیمت یک اسودش صد احمر است[۶]

• • • •

گر نسب را جزو ملت کردہ
رخنہ در کار اخوت کردہ[۷]

• • • •

ہر کہ پا در بند اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد لم یولد است[۸]

۶- رموز بے خودی ، ص ۱۸۸ ۔
۷- ایضاً ، ص ۱۸۹ ۔
۸- ایضاً ، ص ۱۹۰ ۔

سورۃ حجرات سے واضح ہے کہ ذاتیں اور خاندان محض شناخت کے لیے ہیں ، اصلی شرف و فضیلت کا معیار نسب نہیں تقویٰ ہے ۔ علامہ اقبال اسی پر زور دیتے ہیں اور شعوبی ، قبائلی ، نسلی ، لونی اور لسانی امتیازات پر اسلامی نصب العین کی فوقیت تسلیم کرتے ہیں اور یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جہاں سے ہم مذکورہ بالا مسائل کو حل کر سکتے ہیں ۔ باقی رہا لسانی مسئلہ تو اسلام کی عمرانی تاریخ کے مطالعہ میں اس کا جواب موجود ہے ۔ زبانیں اظہار کا وسیلہ ہیں وہ بت نہیں کہ ان کی پوجا کی جائے ۔ صدیوں تک تمدنی سطح پر ترجیحات کا ایک اصول قائم رہا ہے جس کی رو سے عربی کو قرآن پاک کی زبان ہونے کی وجہ سے فوقیت حاصل تھی ، عالم اسلام کی ثقافتی زبان فارسی تھی ، مسلمان جس ملک میں بھی گئے وہاں کی زبان کو انھوں نے اظہار کا وسیلہ بنایا ۔ جس علاقے میں پہنچے وہاں کی علاقائی زبان ان کے لیے تبلیغ و ہدایت کا ذریعہ بنی ۔ زبان کے ساتھ پرستش کا کوئی شائبہ شامل نہیں کیا گیا نہ ملکی اور علاقائی زبانوں کے درمیان کسی مناقشت کی خبر ملتی ہے ۔ بیسویں صدی سے قبل عالم اسلام میں زبانیں جھگڑے کا سبب نہیں تھیں ، کیونکہ اصل اہمیت زبانوں کو نہیں مطالب کو حاصل رہی ۔ زبان تو اظہار کا وسیلہ ہے جو وسیلہ ہوتا ہے اگر وہ مقصد بن جائے تو اس سے کتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ ہمارے لسانی مسائل میں یہی خرابیاں راہ پا چکی ہیں اور فکر اقبال سے ہم ان پر غلبہ پا سکتے ہیں ۔